

تفہیم القرآن

الصف

نام | چوتھی آیت کے فقرے يَقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا سے ماخوذ ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں لفظ صف آ رہا ہے۔

زمانہ نزول | کسی مقبرہ روایت سے اس کا زمانہ نزول معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن اس کے مضامین پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غالباً جنگِ اُحد کے متصل زمانے میں نازل ہوئی ہوگی، کیونکہ اس کے بین السطور میں جن حالات کی طرف اشارہ محسوس ہوتا ہے وہ اسی دور میں پائے جاتے تھے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع ہے مسلمانوں کو ایمان میں اخلاص اختیار کرنے اور اللہ کی راہ میں جان لڑانے پر ابھارنا۔ اس میں ضعیف الایمان مسلمانوں کو بھی مخاطب کیا گیا ہے اور ان لوگوں کو بھی جو ایمان کا جھوٹا دعویٰ کر کے اسلام میں داخل ہو گئے تھے، اور ان کو بھی جو مخلص تھے بعض آیات کا خطاب پہلے دونوں گروہوں سے ہے۔ اور بعض میں صرف منافقین مخاطب ہیں، اور بعض کا روئے سخن صرف مخلصین کی طرف ہے۔ اندازِ کلام سے خود معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں کون مخاطب ہے۔

آغاز میں تمام ایمان لانے والوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہایت مبغوض ہیں وہ لوگ جو کہیں کچھ اور کریں کچھ، اور نہایت محبوب ہیں وہ لوگ جو راہِ حق میں لڑنے کے لیے سب سے پہلے ہوتی دیوار کی طرح ڈٹ کر کھڑے ہوں۔

پھر آیت ۵ سے ۱۰ تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لوگوں کو مستنبط کیا گیا ہے کہ اپنے رسول اور اپنے دین کے ساتھ تمہاری روش وہ نہ ہونی چاہیے جو موسیٰ علیہ السلام اور

عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل نے اختیار کی۔ حضرت موسیٰ کو وہ خدا کا رسول بانسنے کے باوجود جیتے جی تنگ کرنے رہے، اور حضرت عیسیٰ سے کھلی کھلی نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود وہ ان کو جھٹلانے سے باز نہ آئے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس قوم کے مزاج کا سانچا ہی ٹیڑھا ہو کر رہ گیا اور اس سے ہدایت کی توفیق سلب ہو گئی۔ یہ کوئی ایسی قابل رشک حالت نہیں ہے کہ کوئی دوسری قوم اس میں مبتلا ہونے کی تمنا کرے۔

پھر آیت ۸-۹ میں پوری تحدی کے ساتھ اعلان کیا کہ یہود و نصاریٰ اور ان سے ساز باز رکھنے والے منافقین اللہ کے اس نور کو بچانے کی پاد ہے کتنی ہی کوشش کر لیں، یہ پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا میں پھیل کر رہے گا اور مشرکین کو خواہ کتنا ہی ناگوار ہو، رسولِ برحق کا لایا ہوا دین ہر دوسرے دین پر غالب آکر رہے گا۔

اس کے بعد آیات ۱۰-۱۳ میں اہل ایمان کو بتایا گیا ہے کہ دنیا اور آخرت میں کامیابی کی راہ صرف ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر سچے دل سے ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرو۔ آخرت میں اس کا ثمرہ خدا کے عذاب سے نجات، گناہوں کی مغفرت، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت کا حصول ہے، اور دنیا میں اس کا انعام خدا کی تائید و نصرت اور فتح و ظفر ہے۔

آخر میں اہل ایمان کو تلقین کی گئی ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے اللہ کی راہ میں ان کا ساتھ دیا تھا اسی طرح وہ بھی انصار اللہ بنیں تاکہ کافروں کے مقابلہ میں ان کو بھی اسی طرح اللہ کی تائید حاصل ہو جس طرح پہلے ایمان لانے والوں کو حاصل ہوئی تھی۔

اللہ کے نام سے جو رحمن اور رحیم ہے

اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اُس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اور وہ غالب اور حکیم ہے۔

اُسے لوگو جو ایمان لاتے ہو، تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت

ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔ اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح

لے یہ اس خطبہ کی مختصر تہدید ہے۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، تفسیر سورہ الحدید، حاشیہ ۲۰۱۔ کلام کا آغاز

اس تہدید سے اس لیے کیا گیا ہے کہ آگے جو کچھ فرمایا جانے والا ہے اس کو سننے یا پڑھنے سے پہلے آدمی یہ بات اچھی طرح سمجھ لے

کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز اور اس سے بالاتر ہے کہ اس کی خدائی کا چلنا کسی کے ایمان اور کسی کی مدد اور قربانیوں پر موقوف ہو۔

وہ اگر ایمان لانے والوں کو ایمان میں خلوص اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ صداقت کا بول بالا کرنے

کے لیے جان و مال سے جہاد کریں، تو یہ سب کچھ ان کے اپنے ہی جھلے کے لیے ہے۔ ورنہ اس کے ارادے اس کے اپنے ہی

زور اور اس کی اپنی ہی تدبیر سے پورے ہو کر جیتے ہیں، خواہ کوئی بندہ ان کی تکمیل میں ذرہ برابر بھی سعی نہ کرے، بلکہ ساری

دنیائے کران کی مزامت پڑھ جائے۔

۱۔ اس ارشاد کا ایک مدعا تو عام ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اور ایک مدعا خاص ہے جو بعد

والی آیت کو اس کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ پہلا مدعا یہ ہے کہ ایک سچے مسلمان کے قول اور عمل میں

مطابقت ہونی چاہیے۔ جو کچھ کہے اسے کر کے دکھائے، اور کرنے کی نیت یا ہمت نہ ہو تو زبان سے بھی نہ نکلے۔

کہنا کچھ اور کرنا کچھ، یہ انسان کی اُن بدترین صفات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہایت مبغوض ہیں، لہذا کہ

ایک ایسا شخص اس اخلاقی عیب میں مبتلا ہو جو اللہ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتا ہو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح

فرمائی ہے کہ کسی شخص میں اس صفت کا پایا جانا اُن علامات میں سے ہے جو ظاہر کرتی ہیں کہ وہ مومن نہیں بلکہ منافق

ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

آیۃ المنافق ثلاث رزاد مسلم وان

منافق کی تین نشانیاں ہیں اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ

صام وصلیٰ و نزعہم انہ مسلمہ اذا حدث

رکھتا ہو اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو۔ یہ کہ جب بڑا

كذِبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا أَتَمَّنَ خَانَ
(بخاری و مسلم)

تو جھوٹ بولے، اور جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی
کرے، اور جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس
میں خیانت کر گزرے۔

ایک اور حدیث میں آپ کا ارشاد ہے:

اربع من كن فيه كان منافقا خالصا
من كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة
من التفاق حتى يدعها، اذا ائتمن خان، واذا
حدث كذب، واذا عاهد غدر، واذا خاصم
فجور (بخاری و مسلم)

چار صفتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ چاروں پائی جائیں
خالص منافق ہے، اور جس میں کوئی ایک صفت ان میں
سے پائی جائے اس کے اندر نفاق کی ایک خصلت ہے
جب تک کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے۔ یہ کہ جب امانت اس
کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے، اور جب بولے
تو جھوٹ بولے، اور جب عہد کرے تو اس کی خلاف ورزی
کر جائے، اور جب لڑے تو اخلاق و دیانت کی حدیں
توڑ دالے۔

فقہائے اسلام کا اس بات پر قریب قریب اتفاق ہے کہ کوئی شخص اگر اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد کرے مثلاً کسی
چیز کی نذر ماننے، یا بندوں سے کوئی معاہدہ کرے، یا کسی سے کوئی وعدہ کرے، تو اسے وفا کرنا لازم ہے، الیہ کہ وہ کام
بجائے خود گناہ ہو جس کا اس نے عہد یا وعدہ کیا ہو۔ اور گناہ ہونے کی صورت میں وہ فعل تو نہیں کرنا چاہیے جس کا عہد
یا وعدہ کیا گیا ہے، لیکن اس کی پابندی سے آزاد ہونے کے لیے کفارہ میں ادا کرنا چاہیے جو سورہ مائدہ آیت ۸۹ میں
بیان کیا گیا ہے۔ (احکام القرآن للجمعا ص ۱۰۱ ابن عربی)۔

یہ تو ہے ان آیات کا عام مدعا۔ رہا وہ خاص مدعا جس کے لیے اس موقع پر یہ آیات ارشاد فرمائی گئی ہیں تو وہ بعد
والی آیت کو ان کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ مفہوم ان لوگوں کو ملامت کرنا ہے جو اسلام کے لیے مرفوضی
و جاننازی کے لمبے چوڑے وعدے کرتے تھے، مگر جب آزمائش کا وقت آتا تھا تو بھاگ نکلتے تھے ضعیف الایمان لوگوں
کی اس کمزوری پر تو ان مجید میں کئی جگہ گرفت کی گئی ہے۔ مثلاً سورہ نساء آیت ۱۰۱، میں فرمایا: تم نے ان لوگوں کو بھی

صفت بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہیے۔ یا اس سے بھی کچھ بڑھ کر کہتے ہیں خدا یا، یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہیں بھی کچھ اور جہالت دی۔ اور سورہ محمد آیت ۲۰ میں فرمایا "جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی جاتی جس میں جنگ کا حکم دیا جائے؟ مگر جب ایک حکم سورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت بھاگتی ہو۔ جنگ اُحد کے موقع پر یہ کمزوریاں خاص طور پر نمایاں ہو کر سامنے آئیں جن کی طرف سورہ آل عمران میں تیرہویں رکوع سے سترہویں رکوع تک مسلسل اشارت کیے گئے ہیں مفسرین نے ان آیات کی شانِ نزول میں ان کمزوریوں کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں جن پر یہاں گرفت کی گئی ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ جہاد فرض ہونے سے پہلے مسلمانوں میں کچھ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ کاش ہمیں وہ عمل معلوم ہو جاتے جو اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے تو ہم وہی کریں۔ مگر جب بتایا گیا کہ وہ عمل ہے جہاد، تو ان پر اپنی اُس بات کو پورا کرنا بہت شاق ہو گیا۔ مقاتل بن حیان کہتے ہیں کہ اُحد کی جنگ میں ان لوگوں کو آزمائش سے سابقہ پیش آیا اور یہ حضور کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ابن زید کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دلاتے تھے کہ آپ کو دشمنوں کے مقابلے کے لیے نکلنا پڑا تو ہم آپ کے ساتھ نکلیں گے۔ مگر جب وقت آیا تو ان کے وعدے جھوٹے نکلے۔ قتادہ اور ضحاک کہتے ہیں کہ بعض لوگ جنگ میں شریک ہونے بھی تھے تو کوئی کارنامہ انجام نہ دیتے تھے مگر اگر یہ دیکھیں مارتے تھے کہ ہم یوں لڑے اور ہم نے یوں مارا۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ملامت کی ہے۔

۱۔ اس سے اول تو یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے وہی اہل ایمان سرفراز ہوتے ہیں جو اس کی راہ میں جان لڑانے اور خطرے سہنے کے لیے تیار ہوں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ کو جو فوج پسند ہے اس میں تین صفات پائی جانی چاہئیں۔ ایک یہ کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر اللہ کی راہ میں لڑے اور کسی ایسی راہ میں نہ لڑے جو نبی سبیل اللہ کی تعریف میں نہ آتی ہو۔ دوسری یہ کہ وہ بد نظمی و انتشار میں مبتلا نہ ہو بلکہ مضبوط تنظیم کے ساتھ صفت بستہ ہو کر لڑے۔ تیسری یہ کہ دشمنوں کے مقابلے میں اُس کی کیفیت "سیسہ پلائی ہوئی دیوار" کی سی ہو۔ پھر یہ آخری صفت بجائے خود

اور یاد کرو موسیٰ کی وہ بات جو اس نے اپنی قوم سے کہی تھی کہ "اے میری قوم کے لوگو! تم کہو مجھے اذیت دیتے ہو حالانکہ تم خراب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں؟ پھر جب انہوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے، اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

اپنے اندر معنی کی ایک دنیا رکھتی ہے۔ کوئی فوج اُس وقت تک میدان جنگ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند کھڑی نہیں ہو سکتی جب تک اس میں حسب ذیل صفات پیدا نہ ہو جائیں:

— عقیدے اور مقصد میں کامل اتفاق، جو اس کے سپاہیوں اور افسروں کو آپس میں پوری طرح متحد کر دے۔

— ایک دوسرے کے خلوص پر اعتماد، جو کبھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا کہ سب فی الواقع اپنے مقصد میں

مخلص اور ناپاک اغراض سے پاک ہوں، ورنہ جنگ جیسی سخت آزمائش کسی کا کھوٹ چھپا نہیں رہنے دیتی، اور اعتماد ختم ہو جاتے تو فوج کے افراد ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے کے بجائے اٹا ایک دوسرے پر شک کرنے لگتے ہیں۔

— اخلاق کا ایک بلند معیار، جس سے اگر فوج کے افسر اور سپاہی بچے گرا جائیں تو ان کے دلوں میں نہ ایک ڈر

کی محبت پیدا ہو سکتی ہے نہ عزت، اور نہ وہ آپس میں متصادم ہونے سے بچ سکتے ہیں۔

— اپنے مقصد کا ایسا عشق اور اسے حاصل کرنے کا ایسا نچمہ عزم جو پوری فوج میں سرفروشی و جان بازی کا

ناقابلِ تغیر جذبہ پیدا کر دے اور وہ میدان جنگ میں واقعی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ جائے۔

یہی تھیں وہ بنیادیں جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں ایک ایسی زبردست عسکری تنظیم اٹھی جس نے مکران

بڑی بڑی قوتیں پاش پاش ہو گئیں اور صدیوں تک دنیا کی کوئی طاقت اس کے سامنے نہ ٹھیر سکی۔

لے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کو اللہ کا نبی

اور اپنا محسن جاننے کے باوجود کس طرح تنگ کیا اور کیسی کیسی بے وفائیاں اُن کے ساتھ کیں۔ مثال کے طور پر بلا حلف ہو

البقرہ، آیات ۵۱-۵۵-۶۰-۶۱ تا ۶۴- النساء، ۱۵۳- المائدہ، ۲۰ تا ۲۶- الاعراف، ۳۸ تا ۴۱- انا ۱۵۱-

طہ، ۸۶ تا ۹۸- بائبل میں خود یہودیوں کی اپنی بیان کردہ تاریخ بھی اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔ صرت بطور

نمونہ چند واقعات کے لیے دیکھیے خروج ۵: ۲۰-۲۱- ۱۴: ۱۱-۱۲- ۱۶: ۲-۳- ۱۷: ۱۱-۱۰-۱۱-

۱۵-۱۴: ۱-۱۰- ۱۶: ۱۴- ۲۰: ۱-۵- یہاں ان واقعات کی طرف اشارہ مسلمانوں کو خیر دار کرنے کے لیے

کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے نبی کے ساتھ وہ روش اختیار نہ کریں جو بنی اسرائیل نے اپنے نبی کے ساتھ اختیار کی تھی، ورنہ وہ اُس انجام سے دوچار ہوتے بغیر نہیں رہ سکتے جس سے بنی اسرائیل دوچار ہوئے۔

ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جو لوگ خود ٹیڑھی راہ چلنا چاہیں انہیں خواہ مخواہ سیدھی راہ چلائے، اور جو لوگ اس کی نافرمانی پر تھے ہوتے ہوں اُن کو زبردستی ہدایت سے سرفراز نہ فرمائے۔ اس سے یہ بات خود بخود واضح ہوگئی کہ کسی شخص یا قوم کی گمراہی کا آغاز اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ خود اس شخص یا قوم کی طرف سے ہوتا ہے، اذیت اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو گمراہی پسند کرے وہ اس کے لیے راست ہدی کے نہیں بلکہ گمراہی کے اسباب ہی فراہم کرتا ہے تاکہ جن جن راہوں میں وہ بھٹکتا چاہے بھٹکتا چلا جائے۔ اللہ نے تو انسان کو انتخاب کی آزادی (FREEDOM OF CHOICE) عطا فرمادی ہے۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہر انسان کا اور انسانوں کے ہر گروہ کا اپنا کام ہے کہ وہ اپنے رب کی اطاعت کرنا چاہتا ہے یا نہیں، اور راہ راست پسند کرتا ہے یا ٹیڑھے راستوں میں سے کسی پر جانا چاہتا ہے۔ اس انتخاب میں کوئی جبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے۔ اگر کوئی اطاعت و ہدایت کی راہ منتخب کرے تو اللہ اسے جبراً گمراہی و نافرمانی کی طرف نہیں دھکیلتا، اور اگر کسی کا فیصلہ یہ ہو کہ اسے نافرمانی ہی کرنی ہے اور راہ راست اختیار نہیں کرنی تو اللہ کا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ اسے مجبور کر کے طاعت و ہدایت کی راہ پر لائے۔ لیکن یہ جگہ خود ایک حقیقت ہے کہ جو شخص جس راستے کو بھی اپنے لیے منتخب کرے اس پر وہ عملاً ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جب تک اللہ اُس کے لیے وہ اسباب و ذرائع فراہم اور وہ حالات پیدا نہ کر دے جو اس پر چلنے کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ یہی اللہ کی وہ توفیق ہے جس پر انسان کی ہر سعی کے نتیجہ خیز ہونے کا انحصار ہے۔ اب اگر کوئی شخص بھلائی کی توفیق سسرے سے چاہتا ہی نہیں بلکہ اٹھی برائی کی توفیق چاہتا ہے تو اس کو وہی ملتی ہے۔ اور جب اسے بُرائی کی توفیق ملتی ہے تو اسی کے مطابق اس کی زندگی کا سانچا ٹیڑھا اور اس کی سعی و عمل کا راستہ کج ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کے اندر سے بھلائی کو قبول کرنے کی صلاحیت بالکل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی معنی ہیں اس ارشاد کے کہ ”جب انہوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے“ اس حالت میں یہ بات اللہ کے قانون کے خلاف ہے کہ جو خود گمراہی چاہتا ہے اور گمراہی کی طلب ہی میں سرگرم ہے اور اُسی میں آگے بڑھنے کے لیے اپنی ساری فکر و سعی صرف کر رہا ہے اُسے جبراً ہدایت کی طرف موڑ دیا جائے، کیونکہ ایسا کرنا اُس آزمائش اور امتحان کے منشا کو فروت کر دے گا جس کے لیے دُنیا میں انسان کو اتنا

اور یاد کرو عیسیٰ ابن مریم کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ "اے بنی اسرائیل، میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوں رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اُس توراہ کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے، اور بشارت دینے کی آزادی دی گئی ہے، اور اس طرح کی ہدایت پا کر اگر آدمی سیدھا چلے تو کوئی مستول وجہ نہیں ہے کہ اس پر وہ کسی اجواد و خیر کا مستحق ہو بلکہ اس صورت میں تو جسے زبردستی ہدایت نہ ملی ہو اور اس بنا پر وہ گمراہی میں پڑا رہ گیا ہو وہ بھی کسی سزا کا مستحق نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ پھر تو اس کے گمراہ رہنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر آجاتی ہے اور وہ آخرت میں باز پرس کے موقع پر یہ حجت پیش کر سکتا ہے کہ جب آپ کے ہاں زبردستی ہدایت دینے کا قاعدہ موجود تھا تو آپ نے مجھے اس عنایت سے کیوں محروم رکھا؟ یہی مطلب ہے اس ارشاد کا کہ "اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا" یعنی جن لوگوں نے اپنے لیے خود مستحق و نافرمانی کی راہ انتخاب کر لی ہے ان کو وہ اطاعت و فرمانبرداری کی راہ پر چلنے کی توفیق نہیں دیا کرتا۔

۶۔ یہ بنی اسرائیل کی دوسری نافرمانی کا ذکر ہے۔ ایک نافرمانی وہ تھی جو انہوں نے اپنے دو پروردگار کے آغاز میں کی۔ اور دوسری نافرمانی یہ ہے جو اس دور کے آخری امدنی قطعاً اختتام پر انہوں نے کی جس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان پر خدا کی پٹھکار پڑ گئی۔ مدعا ان دونوں واقعات کو بیان کرنے کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو خدا کے رسول کے ساتھ بنی اسرائیل کا ساطر زحیل اختیار کرنے کے نتائج سے خبردار کیا جائے۔

۷۔ اس فقرے کے تین معنی ہیں امدنیوں میں:

ایک یہ کہ میں کوئی الگ اور نرالادین نہیں لایا ہوں بلکہ وہی دین لایا ہوں جو موسیٰ علیہ السلام لائے تھے۔

میں توراہ کی تردید کرتا ہوں نہیں آیا ہوں بلکہ اس کی تصدیق کر رہا ہوں جس طرح ہمیشہ سے خدا کے رسول اپنے سے پہلے آئے ہوئے رسولوں کی تصدیق کرتے رہے ہیں لہذا کوئی وجہ نہیں کہ تم میری رسالت کو تسلیم کرنے میں تامل کرو۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ میں ان بشارتوں کا مصداق ہوں جو میری آمد کے متعلق توراہ میں موجود ہیں لہذا بجائے اس کے کہ تم میری مخالفت کرو، تمہیں تو اس بات کا خیر مقدم کرنا چاہیے کہ جس کے آنے کی خیر کھپے انبیاء نے دی تھی وہ آگیا۔

اور اس فقرے کو بعد والے فقرے کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے تیسرے معنی یہ نکلتے ہیں کہ میں اللہ کے رسول احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق توراہ کی دی ہوئی بشارت کی تصدیق کرتا ہوں اور خود بھی ان کے آنے کی بشارت

دیتا ہوں۔ اس تیسرے معنی کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کا اشارہ اُس بشارت کی طوط ہے جو رسول
مہد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے دی تھی۔ اس میں وہ فرمائی ہے

”خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند
ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی شننا۔ یہ تیری اُس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے خداوند اپنے
خدا سے جمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی
آگ جی کا نظارہ ہوتا کہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے
ہیں۔ میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے
مُنتہ میں نالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری اُن باتوں
کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سننے تو میں اُن کا حساب اس سے لوں گا۔“

(استثنا، باب ۱۸- آیات ۱۵-۱۹)

یہ توراہ کی صریح پیشین گوئی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پرچسپاں نہیں ہو سکتی۔ اس میں حضرت موسیٰ
اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنار ہے ہیں کہ میں تیرے لیے تیرے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ایک
قوم کے ”بھائیوں“ سے مراد خود اسی قوم کا کوئی قبیلہ یا خاندان نہیں ہو سکتا بلکہ کوئی دوسری ایسی قوم ہی ہو سکتی ہے جس کے
ساتھ اُس کا قریبی نسلی رشتہ ہو۔ اگر مراد خود بنی اسرائیل میں سے کسی نبی کی آمد ہوتی تو الفاظ یہ ہوتے کہ میں تمہارے لیے خاتم
بی میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ لہذا بنی اسرائیل کے بھائیوں سے مراد لا محالہ بنی اسماعیل ہی ہو سکتے ہیں جو حضرت ابراہیم
کی اولاد ہونے کی بنا پر ان کے نسبی رشتہ دار ہیں۔ مزید برآں اس پیشین گوئی کا مصداق بنی اسرائیل کا کوئی نبی اس وجہ سے بھی
نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل میں کوئی ایک نبی نہیں، بہت سارے نبی آئے ہیں جن کے ذکر سے بائبل
بھری پڑی ہے۔

دوسری بات اس بشارت میں یہ فرمائی گئی ہے کہ جو نبی برپا کیا جائے گا وہ حضرت موسیٰ کے مانند ہوگا۔ اس سے مراد
ظاہر ہے کہ شکل صورت یا حالات زندگی میں مشابہ ہونا تو نہیں ہے، کیونکہ اس لحاظ سے کوئی فرد بھی کسی دوسرے فرد کے
مانند نہیں ہوا کرتا۔ اور اس سے مراد محض وصفت نبوت میں مماثلت بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ وصفت اُن تمام انبیاء میں

شترک ہے جو حضرت موسیٰ کے بعد آئے ہیں، اس لیے کسی ایک نبی کی یہ خصوصیت نہیں ہو سکتی کہ وہ اس وصف میں اُن کے مانند ہو۔ پس ان دونوں پہلوؤں سے مشابہت کے خارج از بحث ہوجانے کے بعد کوئی اور وجہ مماثلت، جس کی بنا پر آنے والے ایک نبی کی تخصیص قابلِ فہم ہو، اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ وہ نبی ایک مستقل شریعت لانے کے اعتبار سے حضرت موسیٰ کے مانند ہو۔ اور یہ خصوصیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ آپ سے پہلے بنی اسرائیل میں جو نبی بھی آئے تھے وہ شریعت موسیٰ کے پیرو تھے، ان میں سے کوئی بھی ایک مستقل شریعت لے کر نہ آیا تھا۔

اس تعبیر کو مزید تقویت پیشین گوئی کے ان الفاظ سے ملتی ہے کہ "یہ تیری دینی بنی اسرائیل کی، اُس مذمت کے مطابق ہو گا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے جمع کے دن حرب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز بھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہوتا کہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں میں ان کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اس عبرت میں حرب سے مراد وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی مرتباً حکام شریعت دیئے گئے تھے۔ اور بنی اسرائیل کی جس درخواست کا اس میں ذکر کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ اگر کوئی شریعت ہم کو دی جائے تو اُن خوفناک حالات میں نہ دی جائے جو حرب پہاڑ کے دامن میں شریعت دینے وقت پیدا کیے گئے تھے۔ اُن حالات کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے اور بائبیل میں بھی۔ ملاحظہ ہو النقرہ، آیات ۵۵-۵۶-۶۳- الاعراف، آیات ۱۵۵-۱۶۱- بائبیل، کتاب خروج ۱۹: ۱۷-۱۸۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری یہ درخواست قبول کر لی ہے، اُس کا ارشاد ہے کہ میں اُن کے لیے ایک ایسا نبی برپا کروں گا جس کے منہ میں میں اپنا کلام ڈالوں گا۔ یعنی آئندہ شریعت دینے کے وقت وہ خوفناک حالات پیدا نہ کیے جائیں گے جو حرب پہاڑ کے دامن میں پیدا کیے گئے تھے، بلکہ اب جو نبی اس منصب پر مامور کیا جائے گا اُس کے منہ میں بس اللہ کا کلام ڈال دیا جائیگا اور وہ اسے خلق خدا کو سنا دے گا۔ اس تصریح پر غور کرنے کے بعد کیا اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اس کا مصداق کوئی اور نہیں ہے؟ حضرت موسیٰ کے بعد مستقل شریعت صرف آپ ہی کو دی گئی، اُس کے عطا کرنے کے وقت کوئی ایسا مجمع نہیں ہوا جیسا حرب پہاڑ کے دامن میں بنی اسرائیل کا ہوا تھا، اور

والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔

کسی وقت بھی احکام شریعت دینے کے موقع پر وہ حالات پیدا نہیں کیے گئے جو وہاں پیدا کیے گئے تھے۔

یہ قرآن مجید کی ایک بڑی اہم آیت ہے جس پر مخالفین اسلام کی طرف سے بڑی لے دے بھی کی گئی ہے اور بدترین خیانت مجرمانہ سے بھی کام لیا گیا ہے، کیونکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف صاف نام لے کر آپ کی آمد کی بشارت دی تھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے۔

۱۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی احمد بتایا گیا ہے۔ احمد کے دو معنی ہیں۔ ایک، وہ شخص جو اللہ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ دوسرے، وہ شخص جس کی سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہو، یا جو بندوں میں سب سے زیادہ قابل تعریف ہو۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ بھی حضور کا ایک نام تھا۔ مسلم اور ابوداؤد طیبی میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا کہ انا محمد وانا احمد والحاشی... یہ ہیں محمد ہوں اور میں احمد ہوں اور میں حاشر ہوں...۔ اسی مضمون کی روایت حضرت جابر بن مطعم سے امام مالک، بخاری، مسلم، دارمی، ترمذی اور نسائی نے نقل کی ہیں۔ حضور کا یہ اسم گرامی صحابہ میں معروف تھا، چنانچہ حضرت حسان بن ثابت کا شعر ہے:

صلى الله و من يحفت بعرفته والطيبون على المبارك احمد

”اللہ نے اور اس کے عرش کے گرد جگھٹا لگاتے ہوئے فرشتوں نے اور سب پاکیزہ بستیوں نے بابرکت احمد پر

درو پھیلا ہے“

تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے کہ حضور کا نام مبارک صرف محمد ہی نہ تھا بلکہ احمد بھی تھا۔ عرب کا پورا اٹریچہ اس بات سے خالی ہے کہ حضور سے پہلے کسی کا نام احمد رکھا گیا ہو۔ اور حضور کے بعد احمد اور غلام احمد نے لوگوں کے نام رکھے گئے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ زمانہ نبوت سے لے کر آج تک تمام امت میں آپ کا یہ اسم گرامی معلوم و معروف رہا ہے۔ اگر حضور کا یہ اسم گرامی نہ ہوتا تو اپنے بچوں کے نام غلام احمد رکھنے والوں نے آخر کس احمد کا غلام ان کو قرار دیا تھا؟

۲۔ انجیل یوحنا اس بات پر گواہ ہے کہ مسیح کی آمد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین شخصیتوں کے منتظر تھے۔ ایک مسیح دوسرے ایلیاہ د یعنی حضرت ایاس کی آمد ثانی، اور تیسرے وہ نبی۔ انجیل کے الفاظ یہ ہیں:

”اور یوحنا حضرت یحییٰ علیہ السلام کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے: تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انہوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ اس نے کہا میں بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔ انہوں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے، نہ ایلیاہ نہ وہ نبی تو پھر بتیسرے کیوں دیتا ہے؟

ریاب ۱۔ آیات ۱۹-۲۵)

یہ الفاظ اس بات پر صریح دلالت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت مسیح اور حضرت ایاس کے علاوہ ایک اور نبی کے بھی منتظر تھے، اور وہ حضرت یحییٰ نہ تھے۔ اُس نبی کی آمد کا عقیدہ بنی اسرائیل کے ہاں اس قدر مشہور و معروف تھا کہ ”وہ نبی کہہ دینا گویا اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بالکل کافی تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ جس کی خبر تو راہ میں دی گئی ہے؟ مزید برآں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس نبی کی طرف وہ اشارہ کر رہے تھے اس کا ناقطعی طور پر ثبوت تھا۔ کیونکہ جب حضرت یحییٰ سے یہ سوالات کیے گئے تو انہوں نے یہ نہیں کہا کہ کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے۔ تم کس نبی کے متعلق پوچھ رہے ہو۔

۳۔ اب وہ پیشین گوئیاں دیکھیے جو انجیل یوحنا میں مسلسل باب ۱۴ سے ۱۶ تک منقول ہوئی ہیں:

”اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بھیجے گا کہ اب تک تمہارے ساتھ رہے۔ یعنی مددِ حق جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ نہ اسے دیکھتی ہے نہ جانتی ہے۔ تم اسے جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے اور تمہارے اندر ہے۔“ (۱۴: ۱۶-۱۷)

”میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں۔ لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلانے گا“ (۱۴: ۲۵-۲۶)

”اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ

نہیں“ (۳۰:۱۴)۔

”لیکن جب وہ مدکار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے، تو وہ میری گواہی دے گا“ (۲۶:۱۵)

”لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مدکار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا“ (۷:۱۶)

”مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا بلال ظاہر کرے گا۔ اس لیے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا جو کچھ باپ کا ہے وہ سب میرا ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتا ہے اور تمہیں خبریں دیگا“ (۱۵:۱۶)

۴۔ ان عبارتوں کے معنی متعین کرنے کے لیے سب سے پہلے توجہ دینا ضروری ہے کہ مسیح علیہ السلام اور ان کے ہم عصر اہل فلسطین کی عام زبان آرامی زبان کی وہ بولی تھی جسے سُمرانی (SYRIAC) کہا جاتا ہے۔ مسیح کی پیدائش سے دوڑھائی سو برس پہلے ہی سلوٹی (SELEUCIDE) اقتدار کے زمانے میں اس علاقے سے عبرانی رخصت ہو چکی تھی اور سُمرانی نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اگرچہ سلوٹی اور پھر رومی سلطنتوں کے اثر سے یونانی زبان بھی اس علاقے میں پھیل گئی تھی، مگر وہ صرف اُس طبقے تک محدود رہی جو سرکار و دربار میں رسائی پا کر باہر سائی حاصل کرنے کی خاطر یونانیت زدہ ہو گیا تھا۔ فلسطین کے عام لوگ سُمرانی کی ایک خاص بولی (DIALECT) استعمال کرتے تھے جس کے لیے اور تلفظات اور محاورات دمشق کے علاقے میں بولی بدلنے والی سُمرانی سے مختلف تھے۔ اور اس ملک کے عوام یونانی سے اس قدر ناواقف تھے کہ جب سسٹہ میں یروشلم پر قبضہ کرنے کے بعد رومی جنرل تیتس (TITUS) نے اہل یروشلم کو یونانی میں خطاب کیا تو اس کا ترجمہ سُمرانی زبان میں کرنا پڑا۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مسیح نے اپنے شاگردوں سے جو کچھ کہا تھا وہ لامحالہ سُمرانی زبان ہی میں ہو گا۔

دوسری بات یہ جاننی ضروری ہے کہ بائبل کی چاروں انجیلیں اُن یونانی بولنے والے عیسائیوں کی لکھی ہوئی

ہیں جو حضرت عیسیٰ کے بعد اس مذہب میں داخل ہوئے تھے۔ ان تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال و اعمال کی تفصیلات سرمانی بولنے والے عیسائیوں کے ذریعہ سے کسی تحریر کی صورت میں نہیں بلکہ زبانی روایات کی شکل میں پہنچی تھیں اور ان سرمانی روایات کو انہوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے درج کیا تھا۔ ان میں سے کوئی انجیل بھی سترہ سے پہلے کی لکھی ہوئی نہیں ہے، اور انجیل یوحنا تو حضرت عیسیٰ کے ایک صدی بعد غالباً ایشیائے کوچک کے شہر افسس میں لکھی گئی ہے۔ مزید یہ کہ ان انجیلوں کا بھی کوئی اصل نسخہ اُس یونانی زبان میں محفوظ نہیں ہے جس میں ابتداؤں لکھی گئی تھیں۔ مطبع کی ایجاد سے پہلے کے جتنے یونانی مسودات جگہ جگہ سے تلاش کر کے جمع کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی چوتھی صدی سے پہلے کا نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ تین صدیوں کے دوران میں ان کے اندر کیا کچھ رد و بدل ہوئے ہوں گے۔ اس معاملہ کو جو چیز خاص طور پر مشتبہ بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ عیسائی اپنی انجیلوں میں اپنی پسند کے مطابق دانستہ تغیر و تبدل کرنے کو بالکل جائز سمجھتے رہے ہیں۔ انساٹیکو پٹریا بڑا نیکا کے مضمون ”بائبل“ کا مصنف لکھتا ہے:

”اناجیل میں ایسے نمایاں تغیرات دانستہ کیے گئے ہیں جیسے مثلاً بعض پوری پوری عبارتوں کو کسی دوسرے ماخذ سے لے کر کتاب میں شامل کر دینا۔ یہ تغیرات صرف کچھ ایسے لوگوں نے بالقصد کیے ہیں جنہیں اصل کتاب کے اندر شامل کرنے کے لیے کہیں سے کوئی مواد مل گیا، اور وہ اپنے آپ کو اس کا مجاز سمجھتے رہے کہ کتاب کو بہتر یا زیادہ مفید بنانے کے لیے اس کے اندر اپنی طرف سے اس مواد کا اضافہ کر دیں۔ . . . بہت سے اضافے دوسری صدی ہی میں ہو گئے تھے اور کچھ نہیں معلوم کہ ان کا ماخذ کیا تھا“

اس صورت حال میں قطعی طور پر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انجیلوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جہاں اقوال ہمیں ملتے ہیں وہ بالکل ٹھیک ٹھیک نقل جوئے ہیں اور ان کے اندر کوئی رد و بدل نہیں ہوا ہے۔

تیسری اور نہایت اجماع بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتح کے بعد بھی تقریباً تین صدیوں تک فلسطین کے عیسائی باشندوں کی زبان سرمانی رہی اور کہیں نویں صدی عیسوی میں جا کر عربی زبان نے اس کی جگہ لی ان سرمانی بولنے والے اہل فلسطین کے ذریعہ سے عیسائی روایات کے متعلق جو معلومات ابتدائی تین صدیوں کے مسلمان علماء کو حاصل ہوئیں وہ ان لوگوں کی معلومات کی نسبت زیادہ معتبر سمجھنی چاہئیں جنہیں سرمانی سے یونانی اور پھر لونیائی سے لاطینی زبانوں میں ترجمہ و ترجمہ ہو کر یہ معلومات پہنچیں۔ کیونکہ مسیح کی زبان سے نکلے ہوئے اصل سرمانی الفاظ ان کے ہاں محفوظ رہنے

کے زیادہ امکانات تھے۔

۵۔ ان ناقابل انکار تاریخی حقائق کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ انجیل یوحنا کی مذکورہ بالا عبارات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے بعد ایک آنے والے کی خبر دے رہے ہیں جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ "دنیا کا سردار" اور "دوسرا عالم" ہو گا، "ایڈنگ" رہے گا، "سچائی کی تمام راہیں دکھائے گا" اور خود ان کی دینی حضرت عیسیٰ کی "گواہی دے گا"۔ یوحنا کی ان عبارتوں میں "روح القدس" اور "سچائی کی روح" وغیرہ الفاظ شامل کر کے مدعا کو خبط کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، مگر اس کے باوجود ان سب عبارتوں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس آنے والے کی خبر دی گئی ہے وہ کوئی روح نہیں بلکہ کوئی انسان اور خاص شخص ہے جس کی تعلیم عالمگیر، ہمہ گیر اور قیامت تک باقی رہنے والی ہوگی۔ اُس شخصِ خاص کے لیے اردو ترجمے میں "مددگار" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یوحنا کی اصل انجیل میں یونانی زبان کا جو لفظ استعمال کیا گیا تھا، اس کے بارے میں عیسائیوں کو اصرار ہے کہ وہ PARACLETUS تھا مگر اُس کے معنی متعین کرنے میں خود عیسائی علماء کو سخت زحمت پیش آئی ہے۔ اصل یونانی زبان میں PARACLETE کے کئی معنی ہیں: کسی جگہ کی طرف بلانا، مدد کے لیے پکارنا، انذار و تنبیہ، ترغیب، اکسانا، انتہا کرنا، دعا مانگنا پھر لفظ ہیلینی مفہوم میں یہ معنی دیتا ہے: تسلی دینا، تسکین بخشنا، ہمت افزائی کرنا۔ بائبل میں اس لفظ کو جہاں جہاں استعمال کیا گیا ہے، ان سب مقامات پر اس کے کوئی معنی بھی ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ اور انجیل ر ORIGEN نے کہیں اس کا ترجمہ CONSOLATOR کیا ہے اور کہیں DEPRICATOR۔ مگر دوسرے مفسرین نے ان دونوں ترجموں کو رد کر دیا کیونکہ اول تو یہ یونانی گرامر کے لحاظ سے صحیح نہیں ہیں، دوسرے تمام عبارتوں میں جہاں یہ لفظ آیا ہے، یہ معنی نہیں چلتے۔ بعض اور مترجمین نے اس کا ترجمہ TEACHER کیا ہے، مگر یونانی زبان کے استعمالات سے یہ معنی بھی اٹھ نہیں کیے جاسکتے۔ تزلزلان اور آگٹائن نے لفظ ADVOCATE کو ترجیح دی ہے، اور بعض اور لوگوں نے ASSISTANT، اور COMFORTER، اور CONSOLER وغیرہ الفاظ اختیار کیے ہیں۔

د ملاحظہ ہو رسائیکلو پیڈیا آف بلیکل ٹیریچر، لفظ پیر کلیٹس۔

اب دلچسپ بات یہ ہے کہ یونانی زبان ہی میں ایک دوسرا لفظ PERICLYTOS موجود ہے جس

کے معنی میں "تعریف کیا ہوا" یہ لفظ بالکل "محمّد" کا ہم معنی ہے، اور لفظ میں اس کے اور PARACLETUS

کے درمیان بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ بعید ہے کہ جو مسیحی حضرات اپنی مذہبی کتابوں میں اپنی مرضی اور پسند کے مطابق بے تکلف رد و بدل کر لینے کے نگر رہے ہیں انہوں نے یوحنا کی نقل کردہ پیشین گوئی کے اس لفظ کو اپنے عقیدے کے خلاف پڑنا دیکھ کر اس کے املا میں یہ ذرا سا تغیر کر دیا ہو۔ اس کی پڑتال کرنے کے لیے یوحنا کی لکھی ہوئی ابتدائی یونانی انجیل بھی کہیں موجود نہیں ہے جس سے یہ تحقیق کیا جاسکے کہ وہاں ان دونوں الفاظ میں سے دراصل کونسا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔

۴۔ لیکن فیصلہ اس پر بھی موقوف نہیں ہے کہ یوحنا نے یونانی زبان میں دراصل کونسا لفظ لکھا تھا، کیونکہ بہر حال وہ بھی ترجمہ ہی تھا اور حضرت مسیح کی زبان جیسا کہ اوپر ہم بیان کر چکے ہیں فلسطین کی سُرمائی تھی، اس لیے انہوں نے اپنی بشارت میں جو لفظ استعمال کیا ہوگا وہ لامحالہ کوئی سُرمائی لفظ ہی ہونا چاہیے۔ نحویش قسمتی سے وہ اصل سُرمائی لفظ ہمیں ابن ہشام کی شہادت میں مل جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی اسی کتاب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ہم معنی یونانی لفظ کیا ہے۔ مجدد بن سنی کے حوالہ سے ابن ہشام نے ٹیٹس ریوچنا، کی انجیل کے باب ۱۵، آیات ۲۳ تا ۲۷ اور باب ۱۶ آیت ۱ کا پورا ترجمہ نقل کیا ہے اور اس میں یونانی فارقلیط کے بجائے سُرمائی زبان کا لفظ مُنمختا استعمال کیا گیا ہے۔ پھر ابن اسحاق یا ابن ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ مُنمختا کے معنی سُرمائی میں محمد اور یونانی میں برقلیطس ہیں (ابن ہشام، جلد اول، ص ۲۳۸)۔

اب دیکھیے کہ تاریخی طور پر فلسطین کے عام عیسائی باشندوں کی زبان نویں صدی عیسوی تک سُرمائی تھی۔ یہ علاقہ ساتویں صدی کے نصف اول سے اسلامی مقبوضات میں شامل تھا۔ ابن اسحاق نے ۶۸ء میں اور ابن ہشام نے ۷۵۰ء میں وفات پائی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں کے زمانے میں فلسطینی عیسائی سُرمائی بولتے تھے، اور ان دونوں کے لیے اپنے ملک کی عیسائی رعایا سے ربط پیدا کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ نیز اس زمانے میں یونانی بولنے والے عیسائی بھی لاکھوں کی تعداد میں اسلامی مقبوضات کے اندر رہتے تھے، اس لیے ان کے لیے یہ معلوم کرنا بھی مشکل نہ تھا کہ سُرمائی کے کس لفظ کا ہم معنی یونانی زبان کا کونسا لفظ ہے۔ اب اگر ابن اسحاق کے نقل کردہ ترجمے میں سُرمائی لفظ مُنمختا استعمال ہوا ہے، اور ابن اسحاق یا ابن ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ عربی میں اس کا ہم معنی لفظ محمد اور یونانی میں برقلیطس ہے، تو اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ حضرت عیسیٰ نے حضور کا نام مبارک کے کراپ ہی کے آنے کی بشارت دی تھی، اور ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یوحنا

کی یونانی انجیل میں دراصل لفظ PERICLYTOS استعمال ہوا تھا جسے عیسائی حضرات نے بعد میں کسی وقت PARACLETUS سے بدل دیا۔ (باقی)